AL-JAMEI Research Journal
ISSN (Print) 3006-4775 (Online) 3006-4783
https://aljamei.com/index.php/ajrj

Solutions to the Religious and Political Challenges Facing the Establishment of Peace in Pakistan

پاکستان میں قیام امن کے لیے درپیش مذہبی اور سیاسی مشکلات کا حل

Asmat Batool
Ph.D Scholar, Department of Islamic Studies, the Imperial College of Business Studies Lahore, masoodbukhari786@gmail.com
Dr. Arshad Ali
Assistant professor, Imperial College of Business Studies, Lahore

Abstract

One of the major obstacles to the establishment of peace in Pakistan is political issues, which have weakened the state and destabilized the social structure. Since the creation of Pakistan, the country has repeatedly suffered from political instability; at times due to the imposition of martial law, and at other times because of the premature dismissal of democratic governments, both of which have eroded public trust. The persistent power struggles among political leaders and the tendency to prioritize personal interests over national interests have fostered mistrust within state institutions. Corruption and nepotism have not only damaged the economy but have also intensified feelings of deprivation and injustice among the public, often leading to protests and unrest. The unequal distribution of resources, a sense of political deprivation, and disputes over provincial autonomy have given rise to insurgency and disorder in certain regions. Separatist movements in Balochistan and linguistic and political tensions in Sindh and Khyber Pakhtunkhwa are clear evidence of this reality. Similarly, the lack of transparency in the electoral process has become a significant barrier to peace, as allegations of rigging, political intolerance among parties, and the refusal to accept electoral outcomes divide the public. As a result, protest politics, sit-ins, and strikes disrupt public order. Alongside these challenges, a weak judicial system and the absence of the rule of law have deprived citizens of justice, further fueling instability. Thus, political issues undermining peace in Pakistan are not limited to the flawed policies of rulers alone, but are deeply rooted in institutional weaknesses, injustice, and political chaos—without addressing these, sustainable peace remains unattainable.

Keywords: *Political Instability, Corruption and Nepotism, Electoral Transparency, Provincial and Ethnic Conflicts, Rule of Law and Institutional Weakness*

موضوع کا تعارف:

امن کسی بھی ریاست کی بقا، ترقی اور خوشحالی کی بنیادی شرط ہے، پاکستان کا قیام بھی دراصل ایک پر امن اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے عمل میں آیا تھا، جہاں مسلمان اپنی دینی اقدار کے مطابق زندگی گزار سکیں، تاہم پاکستان اپنی تاریخ کے بیشتر حصے میں سیاسی عدم استحکام اور مذہبی تنازعات کا شکار رہا ہے، جس سے اس کی خوشحالی اور ترقی میں بے پناہ رکاوٹیں درپیش رہی ہیں، کسی ملک کی سیاسی رواداری اور سیاست کا توازن امن کے بغیر ناممکن ہے، اسی طرح مذہبی مسائل اس وقت کئی انداز سے سامنے آتے ہیں، جب ملک میں افراتفری ہو اور امن کو شدید خطرات لاحق ہوں۔

پاکستان میں امن کے قیام کی ایک بڑی رکاوٹ سیاسی مسائل ہیں جنہوں نے ریاست کو کمزور اور معاشرتی ڈھانچے کو غیر مستحکم کیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے ملک بار بار سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا ہے، کبھی مارشل لا کے نفاذ اور کبھی جمہوری حکومتوں کے قبل از وقت خاتمے نے عوامی اعتماد کو مجروح کیا۔ سیاسی قیادت کی باہمی رسہ کشی اور ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دینے کی روش نے ریاستی اداروں میں بداعتمادی کو فروغ دیا۔ بدعنوانی اور اقرباپروری نے نہ صرف معیشت کو متاثر کیا بلکہ عوام میں محرومی اور ناانصافی کے احساس کو بڑھایا جو اکثر احتجاج اور بدامنی کا سبب بنتا ہے۔ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، سیاسی نمائندگی میں احساسِ محرومی اور صوبائی خودمختاری کے تنازعات نے بعض خطوں میں شورش اور بدامنی کو جنم دیا۔ بلوچستان میں علیحدگی پسند تحریکیں اور سندھ و خیبر پختونخوا میں لسانی و سیاسی کشیدگی اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ اسی طرح انتخابی عمل میں شفافیت کا فقدان بھی امن کے قیام میں رکاوٹ ہے، کیونکہ دھاندلی کے الزامات، سیاسی جماعتوں کے درمیان عدم برداشت اور انتخابی نتائج کو تسلیم نہ کرنے کی روش عوام کو تقسیم کرتی ہے۔ نتیجتاً احتجاجی سیاست، دھرنے اور ہڑتالیں امن عامہ کو متاثر کرتی ہیں۔ ان تمام مسائل کے ساتھ ساتھ کمزور عدالتی نظام اور قانون کی عدم بالادستی نے بھی عوام کو انصاف سے محروم رکھا، جس نے بدامنی کو جنم دیا۔ یوں پاکستان میں امن کے سیاسی مسائل صرف حکمرانوں کی غلط پالیسیوں تک محدود نہیں بلکہ ادارہ جاتی کمزوریوں، ناانصافی اور سیاسی انتشار کی جڑوں سے جڑے ہوئے ہیں، جن کے خاتمے کے بغیر پائیدار امن ممکن نہیں۔

اسلام، مشاورت اور سیاست:

قیامِ امن کے سیاسی مسائل کو سمجھنے سے پہلے اسلام اور سیاست کے اصولی نظریات کو سمجھنا ضروری ہے، جن کی تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں کس سیاست کی گنجائش ہے پھر اس سیاست اور اس سے جڑے متعلقات کس قدر قیام امن کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں یا پھر قیامِ امن کے پیچیدہ مسئلے کو سدھار سکتے ہیں۔

اسلام اور سیاست کے تعلقات ایک گہرا اور اہم موضوع ہے، جس پر قرآن و سنت میں واضح رہنمائی موجود ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کے مذہبی، اخلاقی، معاشی، اور سیاسی زندگی کے تمام پہلوؤں کو شامل کرتا ہے۔ اسلام میں سیاست کا مقصد صرف حکومت چلانا نہیں بلکہ عوام کی فلاح و بہبود، انصاف کی فراہمی، اور خدا کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس میں رہنما اصول وہ قواعد و ضوابط ہیں جو اسلامی معاشرتی و سیاسی

نظام کی بنیاد فراہم کرتے ہیں اور ان کی پیروی میں ہی معاشرتی سکونت اور استحکام کا راز پوشیدہ ہے۔ اسلام میں سیاست کا آغاز اللہ کی رضا کے حصول سے ہوتا ہے۔ قرآن و سنت میں حکومتی نظم وضبط کی تاکید کی گئی ہے اور یہ بات باور کروائی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں۔ قرآن میں ارشاد ہے: (وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآاَنْزَلَ اللّٰهُ)[1] "اور ان کے درمیان جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو"۔ اسی طرح، پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اپنی حکومت میں لوگوں کے حقوق کا مکمل خیال رکھا اور عدل و انصاف کی بنیاد پر فیصلے کیے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سیاسی حکمرانی کا اصل مقصد خدا کی رضا کا حصول اور انصاف کا قیام ہے۔ اسلام میں حکمرانی کا نظام "شوریٰ" پر مبنی ہے، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دستوری بنیادوں کا ایک واضح اصول مشاورت ہے جس کے مطابق تمام معاملات باہمی مشورے سے طے کیے جاتے ہیں اور کسی کو بھی اجتماعی امور میں مشورہ دینے یا رائے ظاہر کرنے سے روکا نہیں جاتا۔ باہمی مشورے کا اصول آمریت اور مطلق العنانیت اور ملوکیت کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہ اصول صرف آئین سازی اور وضع قوانین کے عمل کا ہی نہیں بلکہ تمام ریاستی اداروں خصوصاً عدلیہ و انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے فرائض وافعال کا بھی احاطہ کرتا ہے قرآن حکیم میں مشاورت کا اصول یوں بیان ہوا ہے: (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ)[2] "اور معاملات میں ان سے مشورہ کریں"۔ یعنی عوامی مشورے اور رائے کی اہمیت ہے، مسلمانوں کو اپنی حکومت کے معاملات میں باہمی مشاورت سے کام لینے کی ہدایت دی گئی ہے۔ اس اصول کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی فیصلے اجتماعی مشاورت پر مبنی ہوں تاکہ حکومت کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات عوام کی مرضی اور مفاد کے مطابق ہوں۔[3]

مشاورت کی نظمِ اجتماعی، حکومت واطاعت اور نفاذ قانون میں اہمیت کے حوالے سے امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قرآن نے اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ بشارت دے دی کہ ان کے لیے ایک ہیئتِ اجتماعی وسیاسی کی شکل میں منظّم ہونے کا وقت آگیا اور یہ نظمِ اجتماعی نسب اور خاندان کی اساس کے بجائے اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہو گا، دوسری طرف درپردہ قریش کے لیڈروں کو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اب تم خواہ کتنا ہی زور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صرف کرو لیکن انہی کمزور و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نیا نظام آرہا ہے جو تمھارے اس فاسد نظام کی بساط الٹ کر رکھ دے گا۔ قرآن کا معروف اسلوبِ بیان تو یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ بالعموم زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے لیکن یہاں اس معروف طریقہ کے خلاف نماز اور انفاق کے بیچ میں شوریٰ کا ذکر آگیا ہے۔ آخر شوریٰ کی اہمیت کا وہ خاص پہلو کیا ہے جس کی بنا پر اس کو نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی؟........ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظمِ اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصلی شکل نماز میں محفوظ کی گئی ہے"۔[4]

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ سے متصلاً قبل واقاموا الصلوۃ کا حکم اپنے اندر بے پناہ وسعت و حکمت سموئے ہوئے، اس کے متعلق امین احسن اصلاحی رقم طراز ہیں:

"شوریٰ کا ذکر نماز کے پہلو بہ پہلو کر کے ایک طرف تو اس کی عظمت نمایاں فرمائی کہ دین میں اس کا کیا درجہ و مرتبہ ہے اور دوسری طرف اس کی تشکیل کی نوعیت بھی واضح فرمادی کہ اس میں امیر و مامور کے حقوق و فرائض کی صورت کیا ہو گی، کس طرح کے لوگ اس کی رکنیّت کے لیے موزوں ہوں گے، جماعت اور خلقِ خدا سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور ان کی اصلی مسئولیّت کس کے آگے ہو گی"۔ [5]

امام قرطبی تفسیر احکام القرآن میں اس حوالے سے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے طرزِ عمل سے استشہاد کرتے ہوئے نہایت اہم اور لطیف نکتہ بیان کرتے ہیں:

"صحابہ کرام نے سب سے پہلے جس معاملہ میں مشورہ کیا وہ خلافت کا معاملہ تھا نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں واضح ارشاد فرمایا تھا یہاں تک کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور انصار کے درمیان معاملہ ہوا جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم اپنی دنیا کے لیے اسی پر راضی ہیں جس پر نبی کریم ﷺ ہمارے دین کے بارے میں راضی تھے۔ مرتدوں کے بارے میں صحابہ نے مشورہ کیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا، صحابہ نے دادا اور اس کی میراث میں مشورہ کیا۔۔۔۔۔[6] امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:" جب تمہارے امراء تم میں سے بہترین لوگ ہوں، تمہارے اغنیاء تم میں سے سخی لوگ ہوں اور تمہارے امور باہم مشورہ سے ہوں تو تمہارے لیے سطحِ زمین، زمین کے بطن سے بہتر ہے۔ جب تمہارے امراء تم میں سے شریر ترین ہوں۔ تمہارے اغنیاء تم میں سے بخیل ترین لوگ ہوں اور تمہارے امور تمہاری عورتوں کے سپرد ہوں تو تمہارے حق میں زمین کا بطن اس کی سطح سے بہتر ہے۔"[7]"

مشاورت کا حکم بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کا حامل ہے۔ اس کے درست نتائج کے لیے ضروری ہے کہ حکمران اور عوام کے درمیان اعتماد، محبت اور خلوص کا رشتہ قائم ہو۔ اگر ماحول میں بداعتمادی اور کشیدگی پائی جائے تو حقیقی مشاورت ممکن نہیں رہتی اور اگر زبردستی اس عمل کو اختیار بھی کیا جائے تو اس کے نتائج منفی اور نقصان دہ ہی ثابت ہوتے ہیں۔ مشاورت کا دائرہ صرف حکمران اور عوام تک محدود نہیں بلکہ ریاست کے تمام اداروں کے درمیان بھی ناگزیر ہے۔ یہی چیز دراصل باہمی رابطہ اور موثر ابلاغ کہلاتی ہے۔ اگر ادارے آپس میں مشاورت اور ہم آہنگی کے بغیر کام کریں تو کارکردگی متاثر ہوتی ہے اور بعض اوقات اختلاف اور عدم یگانگت نقصان دہ شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے حکمران کی ذمہ داری ہے کہ ایسا خوشگوار ماحول پیدا کرے جس میں عوام اپنے نمائندوں اور اکابرین کے ذریعے دلجمعی سے مشاورت میں حصہ لے سکیں۔ اسلامی ریاست میں حکمران، عوام اور تمام ریاستی ادارے ایک ہی مقصد کے تحت ہم آہنگی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اگر مقاصد و نصب العین پر اتفاق نہ ہو تو مشاورت محض بے معنی گفتگو اور ضد بازی میں بدل جاتی ہے۔ طریقہ کار میں اختلاف جائز ہے، لیکن بنیادی اہداف اور مقاصد پر اتفاق ضروری ہے، کیونکہ یہی چیز وہ جذبہ اور حرارت پیدا کرتی ہے جو ریاست کے تمام اداروں کو اپنی بہترین صلاحیتوں کے اظہار پر آمادہ کرتی ہے۔ [8]

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اس حوالے سے نہایت قابل قدر بحث کی ہے اور اس حکم کی مقتضیات میں سے چند اہم امور کی نشاندہی کی ہے۔ اُن کے نزدیک یہ اہم امور بنیادی طور پر پانچ ہیں:

- اول یہ کہ اظہار کی مکمل آزادی ہو تا کہ عوام الناس بلا خوف و خطر اُن خرابیوں کی نشاندہی کر سکیں جو ریاست کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اگر اظہار پر پابندی لگا دی جائے تو پھر مشاورت کے اس اصول کی پابندی کیسے ہو سکتی ہے۔
- دوم یہ کہ جن لوگوں کو ریاستی عہدوں پر فائض کیا جائے وہ عوام کی حمایت رکھتے ہوں۔ خوف یا لالچ کی بنیاد پر حاصل کی گئی وفاداری کوئی فائدہ نہیں رکھتی۔
- سوم یہ کہ مشاورت کے لیے بھی اُن لوگوں کا انتخاب کیا جائے جنہیں عوامی حمایت حاصل ہو۔ نمائندگی کا حق صحیح معنوں میں صرف اُن لوگوں کو ہے جنہیں عام لوگ دل سے پسند کرتے ہوں۔
- چہارم یہ کہ مشورے کے عمل میں شریک لوگ اپنے ضمیر کے مطابق درست مشورہ دیں اور اُن کا یہ مشورہ علم پر مبنی ہونا چاہیے۔
- پنجم یہ کہ باہمی مشاورت سے ایک بار جو فیصلہ ہو جائے اُسے سب لوگ صدق دل سے قبول کریں اور کسی کی من مانی نہ چلنے دی جائے۔ معاملات کا باہمی مشورے پر مبنی ہونے کا حکم یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ محض رسمی مشاورت نہیں بلکہ اس پر حکمران اور عوام سب کا عمل کرنا لازم ہے۔ مشاورت کے اس تمام عمل میں یہ بنیادی حقیقت نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ شوریٰ اور حکمران صرف انہی حدود کے اندر رہ کر فیصلہ کریں گے جو اللہ نے مقرر کی ہیں"۔[9]

مشورہ دیتے وقت شوریٰ کے ارکان پر سب سے پہلی ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ خلوص نیت کے ساتھ دین کے تقاضوں، قرآن و سنت کی ہدایات اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق رائے پیش کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ہر شخص ہر معاملے میں اچھی رائے دینے کا اہل نہیں ہوتا۔ مشورہ دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس معاملے کے تمام پہلوؤں، پیچیدگیوں اور جزئیات سے واقف ہو، ورنہ اس کی رائے ناقص اور غیر مؤثر ثابت ہو گی۔ موجودہ دور کی ریاستیں پیچیدہ نوعیت کے اداروں اور نظامات پر مشتمل ہیں، جن کے مؤثر انتظام و انصرام کے لیے مخصوص علمی پس منظر اور پیشہ ورانہ مہارت ناگزیر ہے۔ آج کا زمانہ تخصص کا ہے، اور ہر بڑے شعبے کے اندر بھی کئی ذیلی شعبے ایسے ہیں جن کے بارے میں درست مشورہ صرف اسی شخص سے لیا جا سکتا ہے جس کے پاس مطلوبہ علم اور تجربہ موجود ہو۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ریاستوں میں عوامی نمائندوں اور ارکان پارلیمنٹ کے اندر مختلف "سٹینڈنگ کمیٹیاں" تشکیل دی جاتی ہیں۔ ان کمیٹیوں کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخصوص موضوعات پر اہل علم، ماہرین اور پیشہ ور افراد کی رائے حاصل کر کے مشاورت کے عمل کو زیادہ بامعنی اور نتیجہ خیز بنایا جا سکے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مشاورت محض رسمی کارروائی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ اور باقاعدہ عمل ہے جس کا مقصد بہتر اور اجتماعی مفاد میں فیصلے کرنا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمان حکمران اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اپنے انتخاب کے عمل سے لے کر روزمرہ امور مملکت، قومی پالیسیوں اور اہم حکومتی فیصلوں تک مشاورت کے اصول پر کاربند رہیں۔ قرآنی احکامات اور نبی اکرم ﷺ کی

سنت اس بات کی واضح رہنمائی کرتی ہیں کہ حکومتی نظام مشاورت پر مبنی ہو اور فیصلے اکثریتی رائے کی بنیاد پر طے پائیں۔ اس تناظر میں اسلام، ظالمانہ آمریت، استبدادی اور جابرانہ طرزِ حکمرانی کو غیر قانونی اور غیر اسلامی قرار دیتا ہے، کیونکہ اس میں طاقت اور اقتدار کسی ایک فرد یا خاندان کے ہاتھ میں مرکوز ہو جاتا ہے۔ اسلامی ریاست میں کسی ایک فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تنہا اپنی رائے سے ریاستی اور حکومتی فیصلے نافذ کرے۔ بلکہ مشاورت کے عمل کے ذریعے جو فیصلہ اکثریت کی رائے سے طے پائے گا، وہی قانون اور پالیسی کے طور پر نافذ العمل ہو گا۔ یہی طرزِ حکمرانی اسلامی عدل، شفافیت اور اجتماعی بھلائی کا ضامن ہے۔[10]

ریاست کے بنیادی مقاصد میں سے اجتماعی اطاعت، معاشی نظام کا قیام، شرعی احکام کا تحفظ اور ان کی عملداری، عدل کا قیام، آئین و قانون کا نفاذ اور اس کی پاسداری، فلاح عامہ کے مختلف شعبہ جات کا قیام، سلامتی و استحکام کا فروغ، ملکیت کا حق اور اس کا تحفظ، اقلیتوں کا تحفظ اور ان کے حقوق وغیرہ شامل ہیں۔ ریاست کے تمام شعبہ جات میں بنیادی فلسفہ ظلم کا خاتمہ اور عدل کا قیام ہوتا ہے، مشہور قول زرّیں ہے کہ (فَإِنَّ الْمُلْكَ يَبْقَى عَلَى الْكُفْرِ وَلَا يَبْقَى عَلَى الظُّلْمِ)[11] "بلاشبہ ایک ملک نظام کفر پر تو بقا حاصل کر سکتا ہے لیکن نظام ظلم پر اس کی بقا ممکن نہیں ہے"۔ ریاستی رٹ (writ) قائم رکھنے اور ظلم کے خاتمے نیز افراد کے باہمی تعاون و مشارکت کے لیے منظم اجتماعی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، جو ریاست کے کام میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں، شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"لما كَانَ الْملك لَا يَسْتَطِيع إِقَامَة هَذِه الْمصَالح كلهَا بِنَفسِهِ وَجب أَن يكون لَهُ بِإِزَاءِ كل حَاجَة أعوان"[12]

"حکمران کے لیے تنہا امور مصالح (حکومتی معاملات) کو سرانجام دینے کی طاقت نہیں ہوتی، لہٰذا ہر کام کے لیے اس کے معاونین کا ہونا ضروری ہے"۔

مشاورت کا عمل محض خانہ پُری یا خالی کارروائی کی غرض سے نہیں کیا جانا چاہیے۔ جو اجتماعی رائے قائم ہو جائے اُس کا اتباع اولی الامر پر بھی لازم ہے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "ولی الامر جب مشورہ لے، اور کتاب اللہ، کتاب الرسول ﷺ اور اجماع سے حکم اور فیصلہ معلوم ہو جائے تو ولی الامر کا فرض ہے کہ اس کے خلاف کسی کی اتباع نہ کرے اگرچہ وہ دین و دنیا کا کتنا ہی بڑا امر اور معاملہ کیوں نہ ہو، غیر کی اتباع جائز نہیں ہے"۔[13]

جاوید احمد غامدی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ "امرھم شوریٰ بینھم" کا تقاضا یہ ہے کہ مشورہ ہی حکمران کے انتخاب کی بنیاد ہے اور نظام کا وجود بھی مشورے کا ہی مرہون منت ہے۔ مشورہ دینے میں سب کو یکساں اہمیت دی جانی چاہیے اور اگر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو اکثریتی مشورے پر فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ انتخاب کے بعد بھی حکمران مسلمانوں کے اکثریتی مشورے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔[14]

سیاسی نظریات کی تشریحات ہر دور میں ہوتی رہی ہیں، ایک طبقہ اس کا حامی تو دوسرا اس کا ماحی نظر آتا ہے، ایک اسے عین اسلام اور دوسرا اسلام سے یکسر مختلف گردانتا ہے، اسی افراط و تفریط نے بے شمار مسائل کو جنم دیا ہے، جسٹس تقی عثمانی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اسلام اور سیاست کے تعلق کے بارے میں آجکل دو ایسے نظریات پھیل گئے ہیں جو افراط و تفریط کی دو انتہاؤں پر ہیں۔ ایک نظریہ سیکولرزم کا ہے جس کے نزدیک اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح انسان کا ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے جس کا تعلق بس اُس کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے۔

سیاست وحکومت کا اُس سے کوئی تعلق نہیں، یہ نظریہ درحقیقت عیسائی تھیوکریسی کی خرابیاں سامنے آنے کے بعد ایک ردعمل کے طور پر اپنایا گیا تھا، اور سیکولر جمہوریت کے رواج کے بعد یہ دنیا میں مقبول ہو گیا، اس نظریے کو مزید تقویت بعض ان دینی حلقوں کے طرز عمل سے بھی ملی جنہوں نے نہ صرف خود اپنی سرگرمیوں کا سارا محور عقائد وعبادات اور زیادہ سے زیادہ اخلاق کی درستی کی حد تک محدود رکھا، بلکہ جو لوگ اس دائرے سے باہر جا کر کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے، اُن پر تنقید بھی کی کہ ایک دیندار آدمی سیاست میں کیوں ملوث ہو؟ یہ نقطہ نظر درحقیقت اسلام کو دوسرے مذاہب پر قیاس کرنے سے پیدا ہوا ہے، حالانکہ یہ قیاس قطعی طور پر غلط ہے۔ اسلام کی ہدایات اور تعلیمات صرف عقائد وعبادات اور اخلاق کی حد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وہ مالیاتی معاملات اور سیاست وحکومت کے بارے میں بھی ہمیں بڑے اہم احکام عطا فرماتا ہے جن کے بغیر اسلام کا کلی تصور نامکمل ہے۔ دوسری انتہا پسندی بعض ایسے افراد نے اختیار کر لی جنہوں نے سیکولرزم کی تردید اس شدت کے ساتھ کی کہ سیاست ہی کو اسلام کا مقصود اصلی قرار دیدیا، یعنی یہ کہا کہ اسلام کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا میں ایک عادلانہ سیاسی نظام قائم کیا جائے، اور اسلام کے باقی سب احکام اس مقصود اصلی کے تابع ہیں۔ لہذا جو شخص سیاست کے میدان میں دین کی سربلندی کیلئے کام کر رہا ہے، بس وہ ہے جس نے دین کے مقصود اصلی کو پالیا ہے، اور جو لوگ سیاست سے ہٹ کر اصلاح نفس، تعلیم، تبلیغ یا اصلاح معاشرہ کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، اور سیاست میں اُن کا کوئی کردار نہیں ہے، وہ گویا تنگ نظر اور دین کے اصل مقصد سے غافل ہیں۔[15]

یہ دونوں نظریات افراط وتفریط کے نظریات ہیں جو اسلام میں سیاست کے صحیح مقام سے ناواقفیت پر مبنی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی ہدایات، تعلیمات اور احکام زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہیں جس میں سیاست بھی داخل ہے لیکن سیاست کو مقصود اصلی قرار دیکر باقی احکام کو اُس کے تابع کہنا بھی غلط ہے، جیسے اسلام نے تجارت کے بارے میں بڑے تفصیلی احکام عطا فرمائے ہیں لیکن اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ تجارت ہی اسلام کا اصل مقصود ہے تو یہ بالکل غلط بات ہو گی، یا مثلاً نکاح کے بارے میں اسلام نے مفصل احکام دیئے ہیں، لیکن ان احکام کی وجہ سے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ نکاح ہی اسلام کا اصل مقصود ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام نے سیاست کے بارے میں بھی اصولی ہدایات اور احکام عطا فرمائے ہیں، لیکن اُس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سیاست ہی اسلام کا مقصود اصلی ہے"۔[16]

حکومت قائم کرنے کے بعد انتظامی معاملات کس طرح چلائے جائیں، اس ضمن میں مفتی تقی عثمانی رقمطراز ہیں:

"سیاست کے باب میں بھی اصولی ہدایات تو اسلام نے عطا فرمادی ہیں لیکن آگے کی یہ تفصیلات کہ حکومت کے کتنے محلے قائم کئے جائیں؟ انتظامی اختیارات کس طرح تقسیم کئے جائیں؟ وزراء ہوں یا نہ ہوں؟ اگر ہوں تو کتنے ہوں؟ وحدانی طرز حکومت ہو یا وفاقی؟ مقننہ ایک ایوان پر مشتمل ہو یا دو ایوانوں پر؟ اس میں مشاورت کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ یہ تفصیلات اسلام نے متعین نہیں فرمائی ہیں، کیونکہ یہ مباحات کا دائرہ ہے، اس دائرے میں ہر زمانے کے اہل بصیرت فیصلے کر کے حالات کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ لہذا جب ہم اسلام کے اصول سیاست کی بات کریں تو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ فقہاء امت کے کلام میں ہمیں یہ تفصیلات مہیا ہوں گی کہ مقننہ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی ہو، یا کابینہ کی تعداد کیا ہو؟ یہ تفصیلات نہ شریعت میں موجود ہیں، اور نہ ان کی ضرورت ہے۔ شریعت کی ہدایت تو آتی تو اُس جگہ ہے جہاں شریعت یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر اس

بات کو لوگوں کی عقل و فہم پر چھوڑ دیا گیا تو لوگ گمراہ ہو جا گے۔ جہاں مباحات کا دائرہ ہے، اُس میں اکثر معاملات کو انسان کی عقل پر چھوڑا گیا ہے۔ اس طرح اسلام کے اصول سیاست ایک طرف نا قابل تبدیلی ہیں، اور دوسری طرف اتنے لچکدار ہیں کہ ان پر عمل کا طریق کار زمان و مکان کے تقاضوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے متعین کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے، ان میں مختلف زمانوں میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ لہذا جب ہم اسلامی سیاست کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کوئی ایسا لگا بندھا طریقہ حکومت نہیں ہوتا جس کی تمام جزوی تفصیلات ہمیشہ کیلئے طے شدہ ہوں، بلکہ اس سے مراد وہ بنیادی تصورات اور وہ اساسی قواعد واصول ہیں جو قرآن وسنت نے متعین فرما دیئے ہیں"۔[17]

اسلام کے ہاں سیاست کا کیا تصور ہے اور اسے کیا مقام حاصل ہے، اس ضمن میں مولانا محمد اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

"سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دین میں سیاست کا مقام کیا ہے؟ اور دین میں ایک صحیح سیاسی نظام کے قیام کی اہمیت کس درجے میں ہے؟ عیسائیت کا یہ باطل نظریہ بہت مشہور ہے کہ "قیصر کا حق قیصر کو دو" اور "کلیسا کا حق کلیسا کو" جس کا حاصل یہ ہے کہ مذہب کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور مذہب وسیاست دونوں کا دائرہ عمل مختلف ہے، دونوں کو اپنے اپنے دائرے میں ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر کام کرنا چاہئے، دین وسیاست کی تفریق کا یہی نظریہ عہد حاضر میں ترقی کر کے 'سیکولرازم' کی شکل اختیار کر گیا جو آج کے نظام ہائے سیاست میں مقبول ترین نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات چونکہ ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہیں جن میں سیاست بھی داخل ہے، اس لئے اسلام میں سیاست کو دین ومذہب سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ چنانچہ عہد حاضر میں بہت سے مسلمانوں نے عیسائیت اور سیکولرازم کے اس باطل نظریے کی پرزور تردید کی، اور یہ ثابت کیا کہ سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا، بقول اقبال مرحوم:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لیکن سیکولرازم اور دین وسیاست کی تفریق کے اس نظریے کی پرزور تردید کرتے ہوئے بہت سے مسلمان مفکرین اور اہل قلم سے ایک نہایت باریک غلطی واقع ہو گئی جو دیکھنے میں بڑی باریک اور معمولی تھی لیکن اس کے اثرات بہت دوررس تھے۔ اس باریک غلطی کو ہم مختصر لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اسے اس طرح تعبیر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے سیکولرازم کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کو سیاسی بنا دیا، کہنا یوں تھا کہ "سیاست" کو دین سے الگ نہ ہونا چاہئے لیکن کہا یوں کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست وحکومت سے متعلق ضرور ہیں اور ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے دوسرے احکام کی طرح ان احکام پر بھی بقدر استطاعت عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے، حاکم کا فرض ہے کہ وہ اسلامی احکام کو نافذ کرے، اور انہی احکام کے مطابق حکومت کرے، اور عوام کا فرض ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق ایسی حکومت کے قیام کی کوشش اور اگر وہ قائم ہو جائے تو اس کی اطاعت کریں"۔[18]

بعض محققین کے ہاں سیاست کے بغیر تحدید مفاہیم کس قدر اسلام کے مقصود اصلی کے لیے زہر قاتل ہیں، اس ضمن میں مولانا اشرف علی تھانوی مزید لکھتے ہیں:

"لیکن عہد حاضر کے بعض مفکرین اور مصنفین جنہوں نے سیکولر ازم کی تردید میں کام کیا، تردید کے جوش میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے سیاست اور حکومت کو اسلام کا مقصود اصلی، اس کا حقیقی نصب العین اور بعثت انبیاء کا مطمح نظر بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قرار دے دیا، اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ کو نہ صرف ثانوی حیثیت دے دی، بلکہ انہیں اسی مقصود اصلی، یعنی سیاست کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک طریقہ قرار دیا۔ اس انتہاپسندی کا پہلا زبردست نقصان تو یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصویر اور اس کی ترجیحات کی ترتیب (Order of Priority) الٹ کر رہ گئی، جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن کر ہمہ وقت دل ودماغ پر چھا گئی، اور جو مقصد تھا وہ ایک غیر اہم وسیلہ بن کر پس منظر میں چلا گیا، چنانچہ اس طرز فکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح کا بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصد زندگی سیاست اور حکومت کی اصلاح ہونا چاہئے کام وہی کام ہے جو اس راستے میں انجام دیا جائے، قربانی وہی قربانی ہے جو اس راہ میں پیش کی جائے، اور مثالی انسان وہی ہے جس نے اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر دن رات اس کے لئے وقف کر رکھے ہوں۔ اور دین کے دوسرے شعبوں مثلاً طاعات وعبادات، زہد وتقوی، تزکیہ نفس اور خشیت وانابت وغیرہ کی نہ صرف یہ کہ کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی، بلکہ جو شخص ان کاموں میں مشغول ہو اس کے بارے میں یہ تصور قائم کر دیا گیا کہ گویا وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے اور دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کا مقصد اصلی سیاست وحکومت قرار پایا، اور عبادات وغیرہ کے احکام کی حیثیت محض وسیلے کی ہو گئی، تو یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کو مقصد پر قربان بھی کرنا پڑتا ہے، اور مقصد کے حصول کے لئے اگر کبھی کسی وسیلے میں کچھ اونچ نیچ یا کمی بیشی بھی ہو جائے تو وہ گوارا کرلی جاتی ہے، لہٰذا مذکورہ انتہاپسندی کے نتیجے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہو گئی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتاہی بھی ہو جائے تو وہ قابل ملامت نہیں، کیونکہ وہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ سیاست کوئی دین کا ایک شعبہ نہیں، بلکہ دین کا مقصود اصلی قرار دینے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تجارت ومعیشت بھی دین کا ایک شعبہ ہے، اس حیثیت سے دین کے بہت سے احکام تجارت ومعیشت سے بھی متعلق ہیں بلکہ کسب حلال کے بہت سے فضائل بھی احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اب اگر ان فضائل کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ دین کا اصل مقصد ہی تجارت ومعیشت اور کسب حلال ہے تو یہ بات اتنی غلط ہو گی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بعینہ اسی طرح سیاست اس معنی میں دین کا ایک شعبہ ضرور ہے کہ دین کے بہت سے احکام اس سے متعلق ہیں، اور اس کے بہت سے فضائل بھی قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں لیکن ان فضائل کی بنیاد پر اس کو دین کا مقصود اصلی قرار دینا ایسی ہی غلطی ہے جیسے تجارت ومعیشت کو دین کا اصل نصب العین قرار دینا"۔[19]

خلاصہ:

یہ ساری تفصیلی بحث دراصل اسلام اور سیاست کے باہمی تعلق اور اس کے درست مقام کے تعین کے بارے میں ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ سیاسی نظریات کی تشریحات مختلف زاویوں سے کی جاتی رہی ہیں، کسی طبقے نے اسے عین دین قرار دیا جبکہ دوسروں نے اسے دین سے بالکل الگ تصور کیا۔ یہی افراط و تفریط بڑے مسائل کا باعث بنی۔ افراط و تفریط کے نتیجے میں بننے والی سیاسی اور مذہبی تنظیمیں وحدت امت کا تصور پیش کرنے کے بجائے انفرادی سوچ پر عمل پیرا نظر آتی ہیں، عوام کے مسائل سے آگاہی نہ رکھنے اور خود ساختہ نظریات کو پروان چڑھانا ان کا مقصود اصلی اور مرکز و محور ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں سیاست کو نہ تو دین سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے دین کا اصل مقصد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر متوازن ہے کہ دین انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے، اور سیاست اس کا ایک اہم مگر جزوی شعبہ ہے۔ اس کی حدود و اصول شریعت نے واضح کر دیے ہیں لیکن تفصیلات اہل عقل و دانش پر چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ممکن ہو۔ ذیل میں قیام امن میں رکاوٹ بننے والے سیاسی اور مذہبی امور کا احاطہ کیا جائے گا۔

حوالہ جات:

---

[1] المائدۃ،۵: ۴۹

[2] آل عمران،۳: ۱۵۹

[3] صفدر محمود، ڈاکٹر ”پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں ماضی، حال، مستقبل“، مقبول اکیڈمی۔ لاہور، ص:۲۷۸

[4] اصلاحی، امین احسن، تدبرِ قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ج:۲، ص:۱۷۹

[5] اصلاحی، امین احسن، تدبرِ قرآن، ص:۱۸۰

[6] قرطبیؒ، محمد بن احمد بن ابو بکر، امام ابو عبد اللہ، "تفسیر قرطبیؒ"، مترجم: مولانا سیّد محمد اقبال شاہ گیلانی، ضیاالقرآن پبلی کیشنز۔ لاہور، ج:۸، ص:۴۳۳

[7] جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی النھی عن الریا، الرقم:۲۲۶۶

[8] تقی عثمانی، مفتی محمد ”اسلام اور سیاسی نظریات“، مکتبہ معارف القرآن۔ کراچی، ص:۳۷۱-۳۷۴

[9] مودودی، ابو الاعلیٰ، سید، تفہیم القرآن، مکتبہ تعبیر انسانیت، لاہور ج:۴، ص:۵۰۹-۵۱۰

[10] خالد علوی، ڈاکٹر، ”اسلام اور دہشت گردی“، دعوۃ اکیڈمی۔ اسلام آباد، ص:۲۷

[11] ابن الاثیر جزری، اَبو الحسن علی بن ابی الکرم، ”الکامل فی التاریخ“، دار الکتاب العربی، بیروت، ج:۹، ص:۳۰۱

[12] الدھلوی، شاہ ولی اللہ، احمد بن عبد الرحیم بن الشھید، ”حجۃ اللہ البالغۃ“، ایفا پبلیکیشنز۔ دہلی ج:۱، ص:۹۵

[13] ابن تیمیہ، سیاست شرعیہ (اُردو ترجمہ)، مولانا ابو العلا محمد اسمعیل گودھروی، کلام کمپنی، کراچی، ص:۲۸۳

[14] غامدی، جاوید احمد، میزان، المورد۔ لاہور، ص: ۴۹۳

[15] عبد الخالق سہریانی بلوچ، پروفیسر ”فرقہ واریت اور انتہا پسندی کے رجحانات“، ایوان علم و ادب پاکستان۔ لاہور، ص:۸۸-۸۹

[16] تقی عثمانی، مفتی محمد ”اسلام اور سیاسی نظریات“، ص:۱۶۲-۱۶۳

[17] تقی عثمانی، مفتی محمد ”اسلام اور سیاسی نظریات“، کراچی، ص:۱۷۳

[18] اشرف علی تھانوی، مولانا محمد ”اسلام اور سیاست“، ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ ملتان، ص:۱۸

[19] اشرف علی تھانوی، مولانا محمد ”اسلام اور سیاست“، ص:۱۹